© rasailojaraid.com

زمین کا کرۂ ہوائی

از جناب مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب سابق صدر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

ہوا جس کے بغیر ہم تھوڑی دیر کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ مظاہر قدرت کا ایک پر اسرار مخزن ہے۔ اس کا علم نہ صرف ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے بلکہ خالص علمی نقطہ نظر سے بھی انتہا درجہ دلچسپ ہے۔ انسان پہلے ہوا کے طبعی خواص سے آگاہ ہوا ---------- پھر اس سے ہوا چکی اور جہاز رانی میں مدد لینے لگا۔ دسویں صدی کے اختتام تک کسی کو کرہ ہوائی کی وسعت کا ذرا بھی اندازہ نہ تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ نور کی شعاعیں اس میں سے گزرتے وقت مڑ جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ابن ہیثم نے گیارہویں صدی کے ابتدائی قرن میں فلکی مشاہدات اور تجربوں کی مدد سے بتایا کہ کرۂ ہوائی میں ہوا کی کثافت اگر نیچے سے لیکر اوپر تک یکساں فرض کی جائے تو اس کی بلندی تقریباً ۵۵ میل ہوگی اور شفق ہوا میں آفتاب کی شعاعوں کے مڑنے سے پیدا ہوتی ہے جبکہ آفتاب فی الحقیقت افق کے نیچے ہوتا ہے اور جب تک آفتاب افق سے ۱۹ درجے نیچے نہ ہولے برقرار رہتی ہے۔ حالیہ تحقیقات سے متجانس کرۂ ہوائی کی بلندی ۵۰ میل برآمد ہوئی ہے اور شفق کی مدت کے متعلق پتہ چلا ہے کہ آفتاب افق سے انتصاباً ۱۸ درجے نیچے رہنے تک قائم رہتی ہے۔ ان نتائج سے ظاہر ہے کہ ابن ہیثم کی تحقیقات قلت آلات کے باوجود کسقدر صحیح اور قابلِ تحسین تھیں۔

ہوا کی کیمیائی ترکیب کا علم اٹھارویں صدی عیسوی کے تیسرے قرن سے شروع ہوا۔ سویڈن کے

ــہ باجازت وشکریہ حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیمیادان شیلے نے ۱۷۷۱ء میں اور انگلستان کے پریسٹلی نے ۱۷۷۴ء میں آکسیجن کو علیحدہ کر کے اس کے خواص دریافت کئے اور بتایا کہ ہوا میں جلنے والی اشیا اس آکسیجن ہی کی بدولت جلتی ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ہوا کی دوسری گیسیں بھی دریافت ہوئیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہوا ان گیسوں کا آمیزہ ہے۔ نیٹروجن آکسیجن آرگون کاربن ڈائی آکسائڈ۔ ہیڈروجن۔ نیون کرپٹون ہیلیم اوزون اور زینون۔ اس فہرست میں گیسوں کے نام ان کی گھٹتی ہوئی مقداروں کی مناسبت سے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ سب سے کم مقدار زینون کی ہے جو دس کروڑ مکعب فٹ ہوا میں صرف ۹ مکعب فٹ ہے لیکن اس کے باوجود کرہ ہوائی میں آکسیجن کی تیزی کو ہلکا کرتا ہے۔ یہ دوسرے عناصر کے ساتھ ذرا مشکل ہی سے ترکیب کھاتی ہے اسی لئے دھماکوا اشیا زیادہ تر اسی کے مرکب ہوتے ہیں۔ ہم ہوائی گیسوں کے کیمیائی خواص پر وقت صرف کرنا نہیں چاہتے۔ تقریباً ہر پڑھا لکھا آدمی ان سے واقف ہے یا ہو سکتا ہے۔ البتہ یہ بتانا مناسب سمجھتے ہیں کہ آرگون جو کسی عنصر سے بھی میل نہیں رکھتی۔ ان دنوں برقی چراغوں کے گولوں میں بھری جاتی ہے، جو عام طور پر گیس بھرے گولے کہلاتے ہیں۔ اس سے وہ جلد خراب ہونے نہیں پاتے۔ کیا عجب کہ آگے چلکر کرپٹون اور زینون بھی اس کام میں استعمال ہوں۔

ہیلیم گیس اس لحاظ سے بھی ممتاز حیثیت رکھتی ہے کہ اس کو سر نارمن لاکیٹو نے اٹھارہ سو پینسٹھ سنہ عیسوی میں زمین پر دریافت ہونے سے پہلے آفتاب کے ضیائی کرہ میں (جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے) طیف پیما کے ذریعہ دریافت کیا۔ زمین کے کرۂ ہوائی میں سر ولیم ریمزے نے ۱۸۹۵ء میں اس کا پتہ چلایا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ ریڈیم، یورنیم، تھوریم وغیرہ جیسے نابکار عناصر کے جواہر کے تکسر یعنی از خود شکست و ریخت ہونے سے خارج ہوتی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں بعض جگہوں پر زمین میں گہرے سوراخ کھودے گئے ہیں۔ جن میں سے یہ گیس بکثرت برآمد ہوتی ہے۔ اور چونکہ ہیڈروجن کے سوا باقی تمام گیسوں سے ہلکی اور اشتعال ناپذیر ہے۔ اس لئے ہوائی جہازوں کو کرۂ ہوائی میں تیرانے کی غرض سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈبوں میں بھر کر استعمال کی جاتی ہے۔

کرۂ ہوائی میں ہیلیم بیرونی فضا سے بھی داخل ہوتی ہے۔ اس مسئلہ کی طرف دنیائے سائنس نے اب تک بہت کم توجہ کی ہے۔ جب شہاب ثاقب ہوا میں جل کر خاک ہوجاتے ہیں تو ان کی ہیلیم ساری کی ساری ہوا میں مل جاتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ایک شبانہ روز میں کم از کم بیس لاکھ شہاب ثاقب ہمارے کرۂ ہوائی میں جذب ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی مجموعی کمیت سے زمین کے ٹھوس حصہ میں لکھوکھا برس میں بھی کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں ہوتا۔ تاہم گیس فضا میں ہیلیم کی مقدار ضرور کسی قدر بڑھ جانی چاہئے آگے چل کر ہم بتائیں گے کہ اس درآمد کے باوجود ہوا میں ہیلیم کا تناسب کیوں مستقل رہتا ہے۔

نیون کے دلفریب سرخ رنگ کے برقی چراغوں سے ہر شہری واقف ہے اس لئے وہ بکثرت تشہیر کے کاموں میں استعمال ہو رہی ہے۔ کرۂ ہوائی کا دباؤ اگرچہ ابن ہیثم کو اچھی طرح معلوم تھا لیکن اس کی صحیح پیمائش ٹورچیلی نے سترہویں صدی کے ابتدائی قرن میں کی۔ اور رابرٹ بائل نے اس کے تیسرے قرن کے شروع میں ہوا کے پچکاؤ سے متعلق اپنا مشہور کلیہ دریافت کیا۔

سطح زمین کے قریب ہم دیکھتے ہیں کہ تمازت آفتاب سے ہوا میں نقل و حرکت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح طوفان باد و باراں کرہ ہوائی کی گیسوں کو باہمدیگر خوب ملائے رکھتے ہیں۔ اس لئے سات آٹھ میل کی بلندی تک ہوا کی کیمیائی ترکیب میں کوئی فرق نہ آنا تعجب کی بات نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کوہ ایورسٹ کی ساڑھے پانچ میل کی بلندی طے کرنے کے بعد کرہ ہوائی کا آبی بخار تقریباً سب کا سب برف وغیرہ کی شکل میں خارج ہوجاتا ہے اور سات میل کی بلندی پہ تو اس کا شائبہ ہی رہتا ہے۔

لیکن انسان کو لئے ہوئے یا اس کے بغیر اڑنے والے غباروں کے ذریعہ مختلف بلندیوں کی ہوا کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کی تشریح سے پتہ چلتا ہے کہ ساڑھے بارہ میل کی بلندی تک بھی ہوا کی کیمیائی ترکیب میں کوئی فرق نہیں آتا۔ البتہ اس کے اوپر آکسیجن کی کسی قدر کمی اور ہیلیم کی بیشی محسوس ہونے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لگتی ہے۔ شاید یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اسٹیونیز نے ۱۱ نومبر ۱۹۳۵ء کو غبارہ میں ۱۳½ میل بلندی تک پرواز کی اور ایک خالی از انسان امتحانی غبارہ رغینر کی نگرانی میں بمقام اسٹنگارٹ ۳۱ جولائی ۱۹۳۴ء کو ۱۹ میل بلندی کی ہوا کی خبر لے آیا۔ طیارہ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ بلند پرواز ریزی نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو کی جو ۱۰½ میل سے متجاوز نہ ہو سکی۔

امتحانی غباروں کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ بلندی کے ساتھ تپش میں کمی صرف ایک معین بلندی کی فضا تک ہی مشاہدہ ہوتی ہے جو ٹروپو پاز کہلاتی ہے۔ خط استوا پر اس کی حد ساڑھے دس میل ہے اور جوں جوں بمقام کا عرض بلد بڑھتا جاتا ہے یہ بلندی گھٹتی ہے اور قطبین پر سات میل سے بھی کمتر رہ جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی تیس میل بلندی تک تپش میں نمایاں کمی نہیں محسوس ہوتی۔ یہ فضا اسٹریٹوسفیر کہلاتی ہے اس کے اوپر تپش بجائے گھٹنے کے بڑھنے لگتی ہے۔

طیفی مشاہدات سے پتہ چلتا ہے کہ اس فضا کے اوپر اوزون کی ایک پتلی پرت ہے جو آفتاب کے بنفشی رنگ سے کمتر طول موج والی شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے اور اس طرح ہماری آنکھوں کو ان کے مضر اثر سے بچاتی ہے ورنہ سب آنکھیں اندھی ہو جاتیں۔ اوزون آکسیجن کا ایک دوسرا اور اس سے زیادہ کیمیائی قابلیت والا روپ ہے جس کا سالمہ بجائے دو جواہر کے تین جواہر پر مشتمل ہے۔ جس بلندی پر ہوا کی تپش میں اضافہ شروع ہوتا ہے یعنی اسٹریٹوسفیر کے ختم پر وہیں سے غیر معمولی جدت کی آوازیں بھی جو سطح زمین سے منتشر ہوتی ہیں منعکس ہو جاتی ہیں۔ یورپ کی گذشتہ بڑی جنگ میں جب فلینڈرز کے میدانوں میں توپیں سر ہوتی تھیں تو ان کی آواز آبنائے برطانیہ میں نہیں سنائی دیتی تھی۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دور مقاموں جیسے انگلستان کے وسطی خطوں کے باشندے اس کو صاف طور پر سن پاتے تھے۔ یہ معما اس وقت حل ہوا جبکہ بلند پرواز امتحانی غباروں کے ذریعہ اسٹریٹوسفیر کی بالائی فضا میں تپش کی ترقی کا پتہ چلا۔ اس ترقی تپش کی وجہ سے آواز کی موجیں مڑی چلی جاتی ہیں اور بالآخر منعکس ہو کر نیچے اتر آتی ہیں۔ اب ایسا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

معلوم ہوتا ہے کہ . . . ۱ اکیلومیٹر یعنی ۶۲۰ میل کی بلندی پر ہوا کی تپش ۶۰۰ درجہ مئی ہے۔ سابقہ جنگ میں جرمنی کی "بگ برتھا" یا پیرس پر گولے برسانے والی توپ کی دوری زد کا راز بھی تھا کہ اس کے گولے اسٹر ٹوسفیر میں ۲۴ میل بلندی سے گزرتے تھے۔

شہاب ثاقب کی روشنی اور ان کی بلندی کے مطالعہ سے بھی لنڈیمان اور ڈاسن نے ۱۹۲۲ء میں نتیجہ اخذ کیا کہ اسٹر ٹوسفیر کے اوپر تپش بڑھنی چاہئے تاکہ اس کے اوپر کی ہوا ایک زیادہ کثافت کے خطہ کو سہار سکے ورنہ جس بلندی پر شہاب ثاقب دہکنے لگتے ہیں قلت کثافت کی وجہ سے دہک نہ سکیں گے۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ پچاس ساٹھ میل کی بلندی پر ہوا کا جسم بالکل ساکن ہے اگرچہ اس کے سالمات منفردہ طور پر نظریہ تحرک کے بموجب ادھر ادھر ضرور اڑتے پھرتے ہیں لیکن شہاب ثاقب کی منور لکیروں کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہاں کی ہوائیں اچھی خاصی رفتار سے مختلف سمتوں میں حرکت کرتی ہے۔ شہاب ثاقب کوئی سو سوا سو میل کی بلندی پر دھکنے لگتے ہیں اور ساٹھ ستر میل کی اونچائی پر پہنچکر عموماً بجھ جاتے ہیں۔ پچاس ساٹھ میل کی بلندی پر بعض اوقات راتوں میں روپہری رنگ کے چمکتے ہوئے ابر بھی دکھائی دیتے ہیں جن کی ماہیت اور پیدائش کا راز ابھی حل نہ ہو سکا۔

لاسلکی خبر رسانی کے ابتدائی دور میں جب دریافت ہوا کہ اس کی موجیں زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باوجود اس کی کروی شکل کے منتقل ہوتی ہیں تو یہ ماننا پڑا کہ وہ بھی فضا کی ایک کافی بڑی بلندی پر پہنچ کر منعکس ہو جاتی ہیں اس خطہ کو ہیوی سائڈ کنیلی طبقہ یا ای لیئر کہتے ہیں جو عموماً ۰ ۷ میل کی بلندی پر واقع ہے یہاں ریڈیو کی بڑی موجیں ہی منعکس ہوتی ہیں۔ انعکاس کا سبب ہوا . . کا ریونائزیشن ہے یعنی اس کے جواہر کے منفی برق والے ذرات (الیکٹرون) مثبت برق والے ذرات (پروٹون) سے جدا ہونے لگتے ہیں۔ پس ریڈیو کی موجیں سیدھا جانے کے عوض مڑ کر بالآخر نیچے اتر آنے لگتی ہیں اسی وجہ سے اس خطہ کو ایونوسفیر بھی کہتے ہیں۔ ۱۴۰ میل کی بلندی پر ایپلٹن طبقہ یا (الف) لیئر شروع ہوتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں سے چھوٹے طول کی لاسلکی موجیں منعکس ہوتی ہیں۔

ایسے کئی تجربے کئے جا چکے ہیں جن میں ایک مقام سے بھیجا ہوا لاسلکی پیام زمین کے سارے محیط کے گرد کئی مرتبہ چکر لگا کر پھر اسی مقام پر صدائے بازگشت کی طرح بار بار سنائی دیتا ہے۔ ریڈیو کی موجوں کی رفتار نوری کی رفتار یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی ثانیہ ہے۔ اس حساب سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ ریڈیو کی موجیں زمین کے اطراف کتنے بار چکر لگا کر واپس آئیں۔

بالائی ہوا کے سکون اور پست تپش کے غلط مفروضوں کی بنا پر پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کرہ ہوائی میں پانچ چھ سو میل کی بلندی پر ہیڈروجن اور ہیلیم کے سوا باقی سب اجزا مفقود ہونگے۔ لیکن طیف نمائی مشاہدات صاف بتاتے ہیں کہ یہاں بھی نیٹروجن اور آکسیجن ہی موجود ہیں مگر نہایت رقیق حالت میں۔ ہماری زمین کے کرہ ہوائی کے سالمات کی رفتار فرار صفر درجہ مئی پر ۴ء۷ میل فی ثانیہ ہے۔ اگر رفتار سالمات اس کے پانچویں حصہ یعنی ۴ء۱ میل فی ثانیہ سے کمتر ہو تو سالمے زمین کے دائرہ کشش سے کبھی بھی باہر نہ جا سکیں گے ہیڈروجن کے سالمات سب سے زیادہ تیز رفتار ہیں لیکن ان کو بھی اس معیاری رفتار تک پہنچنے کے لئے ۸۸ درجے مئی تپش درکار ہے۔ صفر درجہ پر ان کی حقیقی جذر اوسط مربع رفتار صرف ۱ء۱۵ میل فی ثانیہ ہے پس واضح ہے کہ موجودہ حالت میں سطح زمین کے قریب کسی گیس کا سالمہ فرار نہیں ہو سکتا لیکن کرہ ہوائی کے انتہائی بلند خطوں سے ہیڈروجن تھوڑی بہت اب بھی فرار ہو رہی ہے۔

ہیلیم کی جذر اوسط مربع رفتار صفر درجہ مئی پر ۰ء۸۲ میل فی ثانیہ ہے جو ۴ء۱ میل سے بہت کم ہے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس وقت بھی ہیلیم کرہ ہوائی سے غائب ہوتی جا رہی ہے اور اگر زمین کے تابکار اشیا اور شہاب ثاقب سے اس کی تلافی نہ ہوتی تو اس کی مقدار مسلسل گھٹتی چلی جاتی۔ جس ذریعہ سے ہیلیم کے سالمات کی رفتار فراری رفتار سے بڑھ جاتی ہے اس کی تحقیق نہایت دلچسپ ہے۔ ہم فنی دشواریوں کے باوجود اس کو نہایت آسان طریقہ پر سمجھا سکتے ہیں۔ کرہ افق کے انتہائی خوشنما مظاہر میں قطبین کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روشنی ہے جو زیادہ تر زمین کے شمالی و جنوبی مقامات پر اندھیری راتوں میں ابر سے پاک فضا میں مشاہدہ ہوتی ہے۔ آسمان پر زمین کے مقناطیسی محور کے قطبین کے گرد ایک منور تاج نظر آتا ہے جس کا رنگ کبھی گلابی ہوتا ہے اور کبھی بنفشی۔ روشنی کبھی جھالروں یا پردوں کی شکل میں آویزاں نظر آتی ہے۔ یکایک بجلی کی طرح کوندتی ہے۔ آن کی آن میں مدہم پڑ جاتی ہے اور پھر فوراً تازہ دم ہو کر آنکھ مچولی کھیلنے لگتی ہے۔ بعض اوقات یہ تماشا کمتر عرض بلد والی فضا میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۸ء کی رات کو انگلستان کے سواحل پر اس کا جلوہ انتہا درجہ دلکش بیان کیا گیا جس کی تصدیق اس کے فوٹوگرافوں سے ہوتی ہے ۱۸۷۰ء میں یہ مظہر مصر اور ہندوستان میں بھی دکھائی دیا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۹ء کی شب کو آسٹریلیا اور سنگاپور جیسے مقامات پر جو خطِ استوا سے صرف ایک درجہ شمال میں واقع ہیں اور ۱۹۲۱ء میں جنوبی بحرالکاہل کے جزائر ساموا میں جس کا عرض بلد ۱۴ درجہ جنوبی ہے اس کا جلوہ مشاہدہ ہوا۔

قطبی نور جو زمین کے سایہ میں دکھائی دیتا ہے نیلگوں ہے اور اس کا محل وقوع ۶۰ یا ۷۰ میل کی بلندی پر ہے۔ کسی مقام پر سورج افق سے کافی نیچے اتر آنے پر بھی زمین کی سطح سے چھ سو میل بلندی پر کی ہوا اس کے نور سے مستفیض ہو سکتی ہے اور اس وقت بحالتِ شب مقام مذکور پر جو قطبی روشنی مشاہدہ ہوتی ہے اور بھی زیادہ لطف اندوز ہوتی ہے اس کا رنگ گلابی ہے اور اس کے طیف میں آکسیجن اور نیٹروجن کے ایسے خطوط بھی مشاہدہ ہوتے ہیں جو عام طور پر ان گیسوں کی معمولی کثافت کی حالت میں ممنوع متصور ہیں۔ چھ سو میل کی بلندی پر ہوا اتنی رقیق ہے کہ سالمات و جواہر کا تصادم کبھی آدھے ثانیہ سے لیکر ۱۰۰ ثانیوں تک معطل رہتا ہے۔ سالمات یا جواہر (خصوصاً آکسیجن کے) جب نور کے ایک مخصوص طیفی خط کی توانائی کو خارج کر کے مجازاً مدت ہائے مصرحہ تک سستا لیتے ہیں تو کہیں دوسرے خط کی توانائی خارج ہو سکتی ہے۔ لیکن عین اس وقت اگر ہیلیم کا کوئی بھٹکتا ہوا سالمہ ان سے ٹکرا جائے تو آکسیجن کا جوہر بجائے طیفی خط کے ذریعہ اپنی توانائی کو خارج کرنے کے ہیلیم کے سالمہ کو اس شدت کی ضرب لگاتا ہے کہ وہ فراری رفتار سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زیادہ سرعت کے ساتھ زمین کے دائرہ اثر سے باہر نکل پڑتا ہے اور ہمیشہ کے لئے زمین کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے

اندھیری راتوں میں ابر سے خالی آسمان پر جو روشنی دکھائی دیتی ہے وہ فقط ستاروں ہی کی تنویر سے نہیں پیدا ہوتی اور نہ منطقۃ البروج کے نور ہی تک محدود ہے بلکہ ہوا میں دن بھر کی جذب شدہ آفتاب کی روشنی ایک دوسرا جنم لیکر رونما ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے فوٹو گرافی کی تختی پر آکسیجن اور نیٹروجن کے ممنوعہ طیفی خطوط قطبی نور کے خطوط کی طرح اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ ایسے نور کے لئے غیر قطبی نور نام تجویز ہوا ہے۔

اس تقریر کے آغاز میں کرہ ہوائی کے کیمیائی اجزا کی جو تفصیل بتائی گئی وہ صرف دورِ حاضر ہی سے متعلق ہے۔ زمین کا مادہ جب آفتاب سے گیس کی شکل میں نکل کر منجمد ہونے لگا تو اس میں وہ تمام عناصر اسی تناسب میں موجود تھے جو آفتاب کے ضیائی کرہ میں ہیں۔ لیکن بہت جلد تیزی تپش کی وجہ سے مستقل گیسوں کے اکثر سالمات فرار ہو گئے۔ جب تک زمین کافی ٹھنڈی نہ ہولی۔ اس کے گرد کرہ ہوائی پیدا نہ ہو سکا۔ بالآخر جو کرہ ہوائی پیدا ہوا وہ زیادہ تر آبی بخار اور کاربن ڈائی آکسائیڈ ہی پر مشتمل تھا۔ آبی بخار رفتہ رفتہ سمندروں میں تبدیل ہوا اور اس کے بعد سے نباتات کا دور دورہ شروع ہوا۔ آفتاب کے کیمیائی شعاعوں کے زیر اثر نباتات ہوا کی کاربن ڈائی آکسائیڈ سے کاربن لیکر آکسیجن کو آزاد کرنے لگے اور اس طرح حیوانات کی زندگی کا سامان تیار ہونے لگا۔

© rasailojaraid.com